مشائخ چشت اور حکومتِ وقت

باہمی روابط کا تجزیہ

ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی

تصوف کا مزاج شروع ہی سے معاشرہ سے قطع علائق اور کنارہ کشی کا رہا ہے ترکِ دنیا پر جو شدت تاکید صوفیاء کرام کی تعلیمات میں پائی جاتی ہے اس کا نتیجہ فطری طور پر یہی نکلنا تھا۔ حکومت دنیا داری کی واضح ترین علامت اور مظہر رہی ہے چنانچہ امراء سلاطین اور دربار والیوان حکومت سے مکمل بے تعلقی تصوف کا بنیادی عنصر رہا ہے اور اس روش سے انحراف کو عام طور سے سخت ناپسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے۔ ہندوستان کے بعض سہروردی بزرگ جنھوں نے اپنے عہد کے مخصوص حالات اور مصالح کے پیش نظر حکومت وقت سے ایک گونہ تعلقات کی گنجائش رکھی تھی انھیں اپنے اس طرز عمل کے لئے ہدف تنقید بنایا پڑا۔ حکمرانوں سے روابط کے ذریعہ حکومت کی پالیسیوں پر اثر انداز ہونا اور اس کو اصلاح احوال اور صالح اقدار کی ترویج و اشاعت کا ذریعہ بنانا عموماً صوفیا کے لائحہ عمل میں شامل نہیں تھا ان کی مصلحانہ کوششیں صرف ان افراد تک محدود تھیں جو خود اپنی تربیت کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور ان سے وابستہ ہو جاتے تھے۔ معاشرہ کی اصلاح اور اس کو صحیح اسلامی خطوط پر چلانے کی خواہش اور کوشش کا سراغ ان کی حیات اور کارناموں میں نہیں ملتا۔ کم از کم یہی صورت حال ہمیں ہندوستان کے مشہور و معروف صوفی سلسلوں میں نظر آتی ہے۔ ممکن ہے اس طرز عمل کا اپنا ایک جواز اور اس کے اپنے مصالح رہے ہوں۔ مقصد اس روش پر تنقید کرنا نہیں ہے بلکہ محض ایک امر واقعہ کا اظہار ہے۔

ترک دنیا اور حکومت وقت سے مکمل بے تعلقی اور عدم التفات کی یہی روایت مشائخ چشت کو ورثے میں ملی تھی اور وہ اس سلسلے میں اکثر مبالغہ کی حد تک احتیاط سے کام لیتے تھے۔ امرا و سلاطین سے ربط روحانی صحت کے لئے سم قاتل تصور کیا جاتا تھا۔ چونکہ حکومت کا مالی اور انتظامی نظم ونسق تمام تر غیر اسلامی خطوط پر چلایا جاتا تھا اس لئے حکمرانوں کے تحائف اور نذرانے بھی قابل قبول نہ تھے۔ ایسی صورت حال میں ظاہر ہے حکومت سے کسی اور طرح کی وابستگی، ملازمت، دربار سے تعلق یا انعام میں زمین قبول کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔[۱] شیخ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ جب شیخ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد کی ایک زمین کے سلسلہ میں سلطان شمس الدین التمش کے دربار میں تشریف لے گئے تو یہ امر خود سلطان کے لئے حیرت ومسرت کا باعث ہوا۔[۲] اس کے علاوہ تغلق سلاطین کے عہد تک اس قسم کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ سلطان غیاث الدین تغلق کے عہد حکومت میں سلطان المشائخ شیخ نظام الدین اولیا سماع کے سلسلہ میں ایک مباحثہ میں شرکت کی غرض سے دربار میں تشریف لے گئے تھے۔[۳] اس کے بعد سلطان محمد بن تغلق نے بہت سے چشتی بزرگوں کو دربار میں حاضر ہونے پر مجبور کیا۔[۴] یہ حاضری مجبوری کی حاضری تھی اور اس میں اپنی پسند اور مرضی کا دخل نہیں تھا۔

سلطان المشائخ شیخ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ اسی روایت کے وارث اور امین تھے اور اپنی پوری زندگی اس کی توسیع وترویج میں کوشاں رہے۔ برصغیر میں تصوف کی چشتی روایت کو جو عظمت، رونق اور قبول عام ان کے زمانے میں حاصل ہوا اس کی مثال نہیں ملتی

۱؎ حکومت کے سلسلہ میں چشتی موقف کے لئے ملاحظہ فرمائیے:

K.A. Nizami, Some Aspects of Religion and Politics in India during the Thirteenth Century. Delhi: 1974 PP. 240-48

۲؎ میر خورد، سیر الاولیا، لاہور ۱۹۷۸ء ص ۶۲ ۳؎ سیر الاولیا، ص ۵۲۸، ۵۲۹ ۴؎ مثال کے طور پر ملاحظہ فرمائیے سیر الاولیا ص ۲۵۵، ۲۵۵، ۲۶۲، ۲۶۵، ۲۸۱ - ۲۸۳۔

چشتی صوفی تعلیمات کا اعلیٰ ترین منظہر خود ان کی ذات والاصفات تھی۔ حکومت اور امراء و سلاطین کے متعلق ان کے نظریات بھی وہی تھے جو دوسرے چشتی مشائخ کے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے جس جرأت پامردی اور مستقل مزاجی کا ثبوت دیا وہ قابل رشک تھی۔ سلطان جلال الدین خلجی کو یہ حسرت ہی رہی کہ کسی صورت شیخ کی خدمت میں حاضری کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوسکتا[1]۔ کچھ ایسی ہی روایت سلطان علاء الدین خلجی کے سلسلے میں بیان کی جاتی ہے[2]۔ سلطان قطب الدین مبارک خلجی نے دربار میں شیخ کی حاضری کو اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیا تھا اور کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا لیکن چشم فلک نے یہ منظر بھی دیکھا کہ ایک فقیر بوریہ نشین نے کس شان سے حکمران وقت کے سطوت و جبروت کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا اور انجام کار جیت اسی کی ہوئی[3]۔ اس مسئلہ کا ایک پہلو اور بھی ہے جو خود سلاطین کی اپنی ذات سے متعلق تھا۔ سلاطین دہلی کی غالب اکثریت صوفیاء کرام سے عموماً اور مشائخ چشت سے خصوصاً بڑی عقیدت رکھتی تھی اور بہر صورت ان کی خدمت کی متمنی رہتی تھی سلطان قطب الدین خلجی اور سلطان محمد بن تغلق[4] کے ممکنہ استثناء کے علاوہ تقریباً تمام ہی سلاطین دہلی نہ صرف یہ کہ ان کے معاملات میں کسی طرح کی بھی دخل اندازی سے احتراز کرتے تھے، اور انھیں اپنے انداز اور معیار کے مطابق زندگی گزارنے کی پوری آزادی دیتے تھے بلکہ ہر خدمت کے لئے مستعد اور کوشاں رہتے تھے۔ عہد سلطنت میں صوفیاء کرام کو جو عزت و توقیر اور قبول عام حاصل ہوا اس میں حکومت وقت کے طرز عمل کا بھی بہت کچھ دخل تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ عہد علائی میں تصوف کو جو فروغ حاصل ہوا اور خانقاہوں اور لنگروں کو جو گرم بازاری نصیب ہوئی اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ یہ محض ارزانی کا کرشمہ

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۳۵ [2] سیر الاولیاء ص ۱۳۴ - ۱۳۵

[3] سیر الاولیاء ص ۱۶۰ - ۱۶۱، حمید قلندر، خیر المجالس، تصحیح خلیق احمد نظامی، علی گڑھ ص ۲۵۶،
تاریخ فرشتہ، نول کشور، جلد اول، ص ۱۲۵ جلد دوم ص ۳۹۵

[4] پروفیسر خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، دہلی ۱۹۵۸ء ص ۲۸۹ - ۲۹۷، ۳۵۹ - ۳۷۳

نہ تھا۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ فیروز شاہ تغلق کا عہد ارزانی میں عہد علائی سے کچھ پیچھے نہ تھا۔ خانقاہوں اور صوفیار کی سرپرستی بھی تھی۔ لیکن اسی عہد میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جس انداز میں عہد علائی میں تصوف کی گرم بازاری اور اپنے زمانے میں اس کے زوال اور زبوں حالی بلکہ کس مپرسی کا ذکر فرماتے ہیں وہ خود اس کی واضح ترین دلیل ہے[۱]

سلاطین کی پیروی میں بہت سے امرار نے بھی تصوف اور صوفیہ میں گہری دلچسپی ظاہر کی اور ان کے ساتھ عقیدت مندی اور عزت وتکریم کا مظاہرہ کیا لیکن سلطان المشائخ شیخ نظام الدین اولیاؒ سے پہلے کسی قابل ذکر تعداد میں امرار کے چشتی حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کے شواہد نہیں ملتے۔ اسی دور میں صورت حال میں غیر معمولی تبدیلی عمل میں آئی۔ اس عہد میں سلطان وقت سے ایک گونہ خصوصی مراسم استوار ہوئے اور امرار ایک بڑی تعداد میں چشتی سلسلے سے وابستہ ہوگئے۔ برصغیر میں تصوف کی تاریخ کا یہ ایک بڑا اہم موڑ ہے جو بڑے دوررس نتائج اور مضمرات کا حامل تھا اور اس کے عواقب اور اثرات بہت دنوں تک محسوس کئے گئے۔

شیخ نظام الدین اولیاؒ جو بعد میں سلطان المشائخ اور محبوب الٰہی کے القاب سے جانے اور پہچانے گئے پہلے پہل سلطان جلال الدین خلجی کے عہد حکومت میں ان کی شہرت کا آوازہ بلند ہوا۔ مشہور ہے کہ سلطان نے شیخ کی شہرت سنی اور ملنے کا متمنی ہوا لیکن شیخ اس کے لئے آمادہ نہ ہوئے اور یہ ملاقات ممکن نہ ہوسکی[۲]۔ شیخ اور ان کے متعلقین کی عسرت کا حال جان کر سلطان نے چند دیہات بغرض کفالت نذر کرنے چاہے لیکن شیخ کسی طور اس کے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے[۳]۔

سلطان علاء الدین کی تخت نشینی کے بعد شیخ نظام الدین اولیاؒ اور حکومت وقت کے مابین تعلقات کے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے اور جماعت خانہ اور دربار میں تعاون اور مفاہمت کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جس کی مثال مشائخ چشت کی تاریخ میں مفقود ہے۔

---

[۱] خیر المجالس، صـ ۸۷-۸۸، ۱۸۴-۱۸۵، ۲۳۰ [۲] سیر الاولیاء، صـ ۱۲۵
[۳] سیر الاولیاء، صـ ۱۲۴

سلطان علاءالدین کے ابتدائی دور کے بارے میں جب وہ ابھی اپنے آپ کو اچھی طرح مستحکم نہیں کرسکا تھا اور بغاوتوں نیز دوسری مشکلات سے ہنوز نجات نہیں پاسکا تھا، ہمارے پاس معلومات ناکافی ہیں اور یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں ہے کہ اس دور میں شیخ اور سلطان کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔ یہ بات بعید از امکان نہیں ہے کہ سلطان کے مشکلات کے زمانے میں شیخ نے کسی مرحلہ پر کسی طور اس کی کوئی اخلاقی مدد یا پشت پناہی کی ہو اور بعد میں جو عقیدت مندانہ طرزِ عمل سلطان نے شیخ کے سلسلہ میں اختیار کیا اس میں احسان شناسی کا عنصر بھی شامل رہا ہو۔ بہرحال یہ بات ظن و تخمین سے آگے نہیں بڑھتی۔

صوفی اور تاریخی مآخذ اس بات پر متفق ہیں کہ سلطان علاءالدین شیخ نظام الدین اولیاء سے گہری عقیدت رکھتا تھا[۱] اور اپنے اپنے میدان کے یہ دونوں اساطین ایک دوسرے کی شخصیت، صلاحیت اور کارناموں کے معترف تھے۔ اس باب میں بھی شک کی گنجائش کم ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے معاملات اور حلقۂ اثر میں ہر طرح کی مداخلت سے پرہیز کرتے تھے۔ اگر سلطان نے شیخ کے معاملات میں مداخلت سے احتراز کیا تو شیخ نے بھی کاروبارِ سیاست میں کبھی دلچسپی نہیں لی۔ مشائخ چشت کے طرزِ عمل سے عموماً اور شیخ کے طرزِ عمل سے خصوصاً سلطان کو مکمل طور پر یہ اطمینان ہوگیا تھا کہ وہ اس کے منصوبوں اور پالیسیوں نیز اس کے طرزِ حکومت و جہاں بانی کے لئے نہ صرف یہ کہ کوئی خطرہ نہ تھا بلکہ انھوں نے اس کی واضح طور پر غیر اسلامی پالیسیوں پر بھی کبھی اظہارِ نکیر نہیں کیا۔ کم از کم تصوف اور تاریخ کے مآخذ میں اس کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ برنی، سلطان کی بعض پالیسیوں کو انتہائی ظالمانہ اور انسانیت سے بعید تصور کرتا ہے[۲]۔ لیکن اس سلسلہ میں کہیں بھی کوئی اشارہ شیخ کی ناپسندیدگی کا نہیں ملتا۔

۱۔ ضیاءالدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۳۱-۳۳۲، ۳۲۵-۳۴۶، سیر الاولیاء ص ۱۴۳-۱۴۴، ۳۳۶-۳۳۷ - نیز ملاحظہ کیجیے حامد بن فضل اللہ جمالی، سیر العارفین، اردو ترجمہ از ایوب قادری لاہور ص ۹۹، فرشتہ، جلد دوم ص ۳۹۵

۲۔ مثال کے طور پر ملاحظہ کیجیے تاریخ فیروز شاہی ص ۳۳۸-۳۳۹

یہ بات اگرچہ کچھ عجیب اور ناقابل یقین معلوم ہوگی لیکن حقائق اور شواہد کی روشنی میں اس امر میں شبہ کی گنجائش کم ہی نظر آتی ہے کہ یہ دونوں غیر معمولی ہم عصر شخصیتیں ایک دوسرے کے حلقۂ اثر میں اضافہ اور تقویت کے باعث تھے۔ سلطان علاء الدین کے سخت گیر قوانین جنھیں اس نے اپنے انتظامی اور سیاسی مصالح کے پیش نظر باغیانہ اور مجرمانہ رجحانات کے انسداد کے مقصد سے نافذ کیا تھا[1] دلی میں خصوصاً اور دوسرے علاقوں میں عموماً ایک ایسی فضا قائم کرنے کا وسیلہ بنے جس میں صوفی اثرات اور تحریکات کی اشاعت اور مقبولیت کے وسیع تر امکانات مضمر تھے[2] اسی طرح صوفی تحریکات کی کامیابی بالواسطہ طور پر حکومت وقت کی تقویت اور بے فکری کی باعث تھی ظاہر ہے کہ تصوف کی ترک دنیا اور اسی طرح کی منفی اقدار پر یقین رکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ حکومت وقت کے لئے کسی پریشانی کا باعث نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ عصری سیاسی حالات اور ان کے مطالبوں سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ سیاست کے ناپاک اور مادہ پرستانہ نظام۔ سے انھیں کیا لینا دینا تھا۔ انھوں نے تو اپنے دلوں سے اس دنیا کی مایا کو کھرچ پھینکنے کا پختہ عزم کر رکھا تھا۔ یہ دنیائے پلید تو اس لائق نہ تھی کہ اس پر اپنی صلاحیتوں کو ضائع کیا جاتا۔ نفس کشی، ترک دنیا، سیاست و مادیت سے کلی اجتناب اور ان جیسی باتوں پر یقین رکھنے والوں کی تعداد میں جتنا بھی اضافہ ہو جائے حکومت وقت کے لئے اتنا ہی طمینان اور دلجمعی کا باعث ہوگا اور اگر اس تارک الدنیا گروہ کی ہمدردیاں اور نیک خواہشات کسی طور حاصل کی جا سکیں تو عوامی سطح پر اس کا تاثر بہت خوشگوار ہوگا اور حکمراں طبقہ کی مذہبیت اور مذہبی حلقوں کی قدردانی کی بڑی اچھی تصویر عوام کے سامنے آئے گی۔

برنی اس بات پر حیران ہے کہ سلطان علاء الدین خلجی جیسا اولوالعزم اور باغیرت بادشاہ شیخ نظام الدین اولیاؒ کی غیر معمولی مقبولیت اور وسیع حلقہ اثر کو کیوں کر برداشت کرتا تھا[3] حیرت کی بات دراصل یہ ہے کہ برنی جیسا صاحب نظر مورخ اس نکتہ کو نہ سمجھ سکا غالباً وہ خود

---

[1] مثلاً ملاحظہ کیجئے تاریخ فیروز شاہی ص ۲۸۴، ۲۹۵ - ۲۹۸، ۳۳۶، ۳۴۲ - ۳۴۳۔ [2] کچھ اسی قسم کے تاثر کے لئے ملاحظہ کیجئے تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۴۱ - ۳۴۶ [3] تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۲۲

ذاتی طور پر ان حالات میں اتنا الجھا ہوا تھا کہ صورت حال کی صحیح نوعیت اور واقعی اہمیت اس کی نظروں سے اوجھل رہی۔ کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ شیخؒ کے سلسلے میں سلطان کی ارادت اور عقیدت مندی کے دعوے محض زبانی اور دکھاوے کے تھے۔ جہاں تک تاریخی شواہد کا تعلق ہے ان سے یہ بات واضح طور سے مترشح ہوتی ہے کہ سلطان کو شیخؒ سے گہری عقیدت تھی۔ یہ بات اب تقریباً ثابت ہو چکی ہے کہ اگرچہ ذاتی طور پر وہ مذہب کا کچھ زیادہ علم نہیں رکھتا تھا اور نہ ہی عبادات کا کچھ ایسا پابند تھا لیکن مذہب سے جذباتی وابستگی میں کمی نہ تھی[۱] لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ سلطان علاء الدین خلجی ایک بیحد حقیقت پسند بادشاہ تھا۔ عصری سیاسیات پر اور اس پر اثر انداز ہونے والے عوامل پر اس کی گہری نگاہ تھی۔ ایسے بالغ نظر بادشاہ سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے ذاتی جذبات کو اپنی سیاسی بصیرت اور عصری سیاسی تقاضوں پر غالب ہونے کی اجازت دے سکتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں شبہ کی گنجائش کم ہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ طرز عمل ایک باقاعدہ سوچی سمجھی اسکیم کا جزء تھا جس کے مختلف پہلوؤں پر اچھی طرح سوچ بچار کر لیا گیا تھا۔

اس پوری صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ علاء الدین خلجی نے چشتی سلسلہ کی حمایت میں اپنا پورا وزن ڈال دیا۔ اس وقت جیسا کہ معلوم ہے چشتی سلسلہ کے سربراہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ تھے۔ شیخ سے عقیدت اور چشتی سلسلہ کے باب میں حکومت کے موقف کے اعلان کے طور پر سلطان نے ایک غیر معمولی قدم اٹھایا۔ اس نے ولیعہد سلطنت شاہزادہ خضر خاں، شاہزادہ شادی خاں اور دوسرے شاہزادوں کو شیخ کی خدمت میں بھیجا اور شیخ کے حلقہ ارادت میں داخل ہونے کی ہدایت کی[۲] یہ ہر پہلو سے ایک غیر معمولی اقدام تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اقدام گویا سلسلہ چشتیہ کو ایک طرح سے سرکاری سلسلہ کی حیثیت دینے اور اس کو سرکاری سرپرستی میں لینے کے اعلان کے مترادف تھا۔ حکومت

۱۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۹۵ - ۲۹۶، ۳۳۹۔ نیز ملاحظہ کیجئے پروفیسر خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ۱۹۵۸ء دہلی، ص ۲۴۱ - ۲۵۰۔

۲۔ تاریخ فیروز شاہی، ۳۹۴، سیر الاولیاء، ص ۱۴۴، امیر خسرو، دول رانی خضر خاں، علی گڑھ ص ۱۵، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار، مطبع احمدی، ص ۶۸، تاریخ فرشتہ، جلد دوم ص ۳۹۴ - ۳۹۵۔

وقت کے سلسلہ میں مشائخ چشت کے طرز عمل کو ذہن میں رکھا جائے تو جس حکمت عملی سے علاء الدین نے اسے سرکاری مقاصد کی توسیع کے لئے استعمال کیا اس پر حیرت ہوتی ہے۔ اس دور میں تصوف کی عام مقبولیت، خانقاہوں اور لنگروں کی خوش حالی اور رونق اور پھر حکمراں طبقے کی شیخ نظام الدین سے عقیدت اور قریبی روابط سے عوامی سطح پر حکمرانوں کی بڑی خوش گوار تصویر ابھر کر سامنے آئی۔ سلطان علاء الدین کی زیر سرکردگی حکومت وقت کا جبر و استبداد، ذاتی زندگی میں اسلامی تعلیمات سے انحراف اور بے تعلقی، عبادات کی عدم پابندی، مجرموں کو دی جانے والی سزاؤں میں نہ صرف شرعی حدود سے تجاوز بلکہ عام سلاطین اور حکمرانوں کی قائم کردہ روایات سے بھی تجاوز۔[1] غرض سلطان اور حکمراں طبقے کی غیر اسلامی زندگی اور حکومت کی غیر اسلامی پالیسیوں کے باوجود سلطان کی شخصیت اور حکومت کا مجموعی تاثر عوام پر یہ پڑا کہ ایک ہی نسل بعد عوام کے ذہن و دماغ میں اس کا تصور ایک ولی کی حیثیت سے جاگزیں ہو چکا تھا اور لوگ اپنی حاجت روائی کے لئے اس کی قبر پر دھاگے باندھتے تھے اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی مجلس میں یہ ذکر تھا کہ لوگوں کی حاجتیں پوری بھی ہوتی تھیں۔[2]

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ولیعہد سلطنت اور دوسرے شاہزادوں کو شیخ کے حلقہ ارادت میں داخل ہونے کا حکم دے کر گویا سلطان نے اپنی عظیم اور طاقت ور حکومت کا پورا وزن چشتی سلسلہ کی پشت پناہی پر لگا دیا۔ امراء نے بھی اس اشارے کو سمجھ لیا اور غیر معمولی تعداد میں شیخ کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے۔[3] اس غیر معمولی صورت حال کا اندازہ کسی قدر اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مآخذ میں شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے جتنے مریدین کے نام محفوظ رہ گئے ہیں ان میں امراء اور عہدیداران حکومت کا تناسب قریب ۲۲ فیصد ہے۔ شاہزادوں، اراکین حکومت، امراء اور عہدیداران کی اس بڑی تعداد میں شیخ سے وابستہ ہونے کا ایک ظاہری اثر یہ ہوا کہ چشتی سلسلہ کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کی ایک عمومی فضا قائم ہو گئی۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اس عہد میں چشتی سلسلہ کو جو غیر معمولی قبول عام حاصل ہوا وہ ایک حد تک حکومت کی پالیسی

---

[1] تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۵۲، ۲۷۶، ۳۳۶، ۳۳۸، ۳۸۶۔ [2] خیر المجالس ص ۲۴۲ - ۲۴۳

[3] مثلاً ملاحظہ کیجئے سیر الاولیاء، ص ۱۴۳-۱۴۴، ۲۸۹، ۳۵۰، ۴۲۲، ۵۲۴، ۵۲۲، تاریخ فیروز شاہی ص ۲۴۳، ۳۴۵، تاریخ فرشتہ، جلد دوم، ص ۳۹۴

کا بھی مرہون منت تھا۔ جہاں تک اس پالیسی کے سیاسی مضمرات کی بات ہے وہ کچھ ایسی بہت زیادہ ڈھکی چھپی بھی نہیں ہے کہ اسے سمجھنے کے لئے بہت زیادہ دقت نظر کی ضرورت ہو۔

جہاں تک تاریخی شواہد کا تعلق ہے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ سلطان نے کبھی کوئی جائداد اور زمین شیخ کو نذر کی ہو اس لئے یہ محض ایک نظریاتی دلچسپی کا مسئلہ رہ جاتا ہے کہ اگر ایسی کوئی صورت حال پیش آئی ہوتی تو شیخ کا طرزِ عمل کیا ہوتا۔ سلطان جلال الدین کے سلسلہ میں شیخ کے طرزِ عمل سے اگر کوئی اشارہ ملتا ہے تو یہی خیال کیا جاسکتا ہے کہ اگر ایسی صورت پیش آئی تو شیخ کا طرزِ عمل ویسا ہی ہوتا[1] لیکن جہاں تک نقد نذرانوں کا تعلق ہے اس سلسلہ میں ہمیں شیخ کے طرزِ عمل میں واضح تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔ غالباً ان بہت ہی خصوصی تعلقات کی وجہ سے جو اس عہد میں دربار اور چشتی جماعت خانہ کے درمیان قائم ہو گئے تھے اس باب میں خصوصی رعایت سے کام لیا گیا۔ شیخ نظام الدین اولیاءؒ سے پہلے عام طور پر مشائخ چشت نے حکمرانوں کے عطیات کو شاذ و نادر ہی قبول کیا ہے لیکن شیخ نے بظاہر بغیر کسی تحفظ کے اس طرح کے نذرانے قبول کئے۔[2] کم از کم کسی طرح کے تحفظ یا تردد کی کوئی شہادت تاریخی اور صوفی مآخذ میں نہیں ملتی۔ سیر الاولیاء اور دوسرے مآخذ میں اس قسم کی متعدد مثالیں پائی جاتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان نے متعدد مواقع پر بڑے بڑے نذرانے شیخ کی خدمت میں بھیجے اور وہ قبول بھی کئے گئے۔ ان مآخذ میں کوئی بھی ایسی مثال دستیاب نہیں ہے جب شیخ نے ایسا کوئی نذرانہ قبول نہ فرمایا ہو۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ رقوم کن مصارف میں خرچ کی جاتی تھیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اس طرح کے نذرانے بغیر کسی طرح کے تحفظ کے قبول کئے جاتے تھے۔ یہ چشتی سلسلہ کی جانی پہچانی روایات کے بالمقابل ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔

شیخ کے اپنی ذات سے متعلق اخراجات تو برائے نام تھے البتہ جماعت خانہ اور اس سے متعلق امور کے انتظام کے لئے بڑے اہتمام کی ضرورت ہوتی تھی۔ صرف باورچی خانہ کا

---

[1] سیر الاولیاء، ص ۱۲۴ [2] تاریخ فرشتہ، جلد دوم ص ۳۹۲، سیر العارفین، اردو ترجمہ، ص ۱۰۰، ۱۰۶

روزانہ کا خرچ علاوہ جنس کے دو ہزار ٹنکہ تھا[1] مسافروں پر اخراجات اور تحائف و عطیات جو بھی آنے جانے والوں کو مسلسل دیئے جاتے رہتے تھے وہ بھی اس میں شامل نہ تھے[2]۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لیے وسیع مالی وسائل درکار تھے۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ جنس یا نقدی کو جمع کر کے رکھنے کا رواج نہ تھا بلکہ ہر جمعہ کو جو کچھ بھی ذخیرہ ہوتا تھا غرباء و مساکین میں تقسیم کر دیا جاتا تھا[3]۔ اس صورت میں روزانہ کی ضروریات اور دوسرے مصارف کے لئے اجناس اور نقدی کی مستقل اور غیر منقطع آمد کی ضرورت تھی[4]۔ سلطان علاء الدین کے عہد کی عمومی ارزانی اور فراخی نیز شیخ کی زیارت کے لئے آنے والوں کی کثرت تعداد کو ذہن میں رکھا جائے تو یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ جماعت خانہ کے اخراجات کا ایک معتدبہ حصہ ان عام زائرین کے نذرانوں سے پورا ہوتا ہوگا اس لئے کہ یہ دستور تھا کہ ہر آنے والا کچھ نہ کچھ نذر ضرور پیش کرتا تھا لیکن یہ بات بھی بھولنی نہ چاہیئے کہ ہر آنے والے

---

[1] سیر العارفین، اردو ترجمہ، صہ ۱۰۱، فرشتہ، جلد دوم، صہ ۲۹۵۔ فرشتہ (جلد دوم، صہ ۳۹۵) کے بیان کے مطابق شیخ کے مطبخ میں روزانہ ۷۰ من نمک استعمال ہوتا تھا۔ یہ یاد رہے کہ من سے مراد موجودہ من نہیں ہے۔ اس عہد کی ارزانی کے لئے ملاحظہ کیجئے تاریخ فیروز شاہی، صہ ۳۱۲، ۳۱۲ - ۳۱۵ ٹنکہ برطانوی ہندوستان کے روپیہ مساوی تھا البتہ اس میں چاندی کی مقدار کسی قدر زیادہ ہوتی تھی۔ ٹنکہ کی قوت خرید کا اندازہ کرنے کے لئے چند مثالیں کافی ہونگی۔ ایک ٹنکہ میں موجودہ زمانے کے سیر سے ۸۸ سیر گندم اور ۹۸ سیر چنا، گیہوں اور ماش خریدا جا سکتا تھا۔ ایک غلام دس ٹنکہ میں اور گوشت کے لئے استعمال کی جانے والی گائے ڈیڑھ سے دو ٹنکہ میں خریدی جا سکتی تھی۔ عمدہ قسم کے بار برداری کے جانور کی قیمت ۸ ٹنکہ تھی۔ مزید دیکھئے Mohammad Habib & K. A. Nizami, A Comperhensive History of India vol. V P 379

[2] سیر العارفین، صہ ۱۰۱، فوائد الفواد، لاہور صہ ۲۳۔ [3] سیر الاولیا، صہ ۱۴۱

[4] شیخ کی خدمت میں پہنچنے والے فتوح کی مقدار کا کسی قدر اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جسے فرشتہ نے نقل کیا ہے کہ شیخ کی خدمت میں ایک تاجر حاضر ہوا اور شیخ صدر الدین عارف کا خط سفارش میں پیش کیا۔ اس تاجر کا سارا مال و اسباب لٹ گیا تھا۔ شیخ نے حکم دیا کہ چاشت کے وقت تک جو کچھ بھی آئے اسے دیدیا جائے۔ گننے جانے پر یہ رقم ۱۲ ہزار ٹنکہ نکلی۔ دیکھئے فرشتہ، جلد دوم، صہ ۲۹۵ نیز دیکھئے صہ ۳۹۳

کو کچھ نہ کچھ دیا بھی جاتا تھا۔ اس لئے عام زائرین کے نذرانوں سے اتنے بڑے کارخانے کا چلنا ممکن نہ تھا۔ اس کے لئے بڑی مقدار میں نقدی کی مستقل آمد کی ضرورت تھی اور یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر وسائل کی فراہمی حکمراں طبقہ ہی کر سکتا تھا۔ بلاشبہ جب قطب الدین خلجی نے امراء کو شیخ کی خدمت میں حاضر ہونے سے روک دیا تھا تو بھی نہ صرف یہ کہ باورچی خانے کے اخراجات اپنی سطح پر قائم رکھے گئے بلکہ روایات کے مطابق ان کو دگنا کر دیا گیا تھا[1] لیکن کسی لمبی مدت تک طبقہ امراء کے نذرانوں کے بغیر اخراجات کا یہ معیار قائم نہیں رکھا جاسکتا جیسا کہ بعد میں نصیر الدین کے عہد میں یہ بات واضح طور پر سامنے آئی۔ شیخ نصیر الدینؒ نے بڑے تاسف سے صوفیہ کے حال زار کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ متعدد لنگروں کا ذکر فرماتے ہیں جو اب بند ہو چکے ہیں اور پھر بڑی حسرت سے سلطان علاء الدین کے عہد میں صوفیہ اور تصوف کی گرم بازاری کا ذکر کرتے ہیں[2] حالانکہ تصوف میں سلطان فیروز شاہ کو غیر معمولی دلچسپی تھی اور جہاں تک ارزانی کا مسئلہ ہے تو اس سلسلہ میں فیروز شاہ کا عہد بھی یادگار ہے[3] پھر تصوف کے اس زوال کا سبب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ حکمراں طبقے اور عہدیداران حکومت کا جو غیر معمولی رجحان سلطان کے طرز عمل کے نتیجے میں خصوصاً چشتی سلسلہ کی طرف ہو گیا تھا وہ اب باقی نہ رہا تھا اور نتیجے کے طور پر تصوف کی کساد بازاری کا ذکر عام ہے۔

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ سلطان علاء الدین شیخ نظام الدین اولیاءؒ سے گہری عقیدت کا اظہار کرتا تھا لیکن دونوں کی کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔ چشتی روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ایک مرتبہ سلطان نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی لیکن شیخ نے اجازت نہ دی[4] یہ طرز عمل مشائخ چشت کے جانے پہچانے طریقہ کے عین مطابق تھا لیکن بعض ایسے شواہد بھی موجود ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بات صرف اتنی ہی نہیں ہے بلکہ اس داستان کے بعض پہلو اور بھی ہیں جو عموماً نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں کیونکہ وہ اس تصویر اور تصور سے مطابقت نہیں رکھتے جو چشتی سلسلہ کی اس باب میں پیش کی جاتی رہی ہے۔ میر خورد صاحب سیر الأولیاء اور مورخ ضیاء الدین برنی دونوں ہی

---

1. خیر المجالس، ص ۲۵۸، سیر العارفین ۱۰۰-۱۰۱ 2. خیر المجالس ص ۸۷-۸۸، ۱۸۴-۱۸۵، ۲۴۰
3. ملاحظہ کیجئے، شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ، ص ۲۹۳-۲۹۴
4. سیر الاولیاء، ص ۱۴۴-۱۴۵

اس بات پر شدید غم و غصہ کا اظہار کیا ہے اور اسے سلطان کی قساوت قلبی سے تعبیر کیا ہے کہ شیخ سے اتنے قرب مکانی کے باوجود کبھی اس کے دل میں شیخ سے ملاقات کا خیال نہ آیا جب کہ لوگ کڑے کوسوں سے کتنی ہی صعوبتیں جھیل کر اس سعادت سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے دیوانہ وار چلے آتے تھے۔[۱] سیر العارفین کے مصنف جمالی لکھتے ہیں کہ دربار علائی کے ایک رکن رکین اور شیخ کے فیض یافتہ قیر بیگ نے سلطان کے سامنے اس سلسلہ میں اپنی حیرت کا اظہار کیا کہ اتنی عقیدت کے باوجود اس نے کبھی شیخ سے ملاقات نہیں کی۔ جواب میں سلطان نے کہا کہ وہ اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں پاتا۔[۲] یہ اعتراف حقیقت تھا یا محض بات ٹالنے کا ایک طریقہ۔ جو کچھ بھی ہو یہ بات واضح طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے کہ شیخ سے ملاقات نہ کرنے کا فیصلہ سلطان نے کیا تھا نہ کہ شیخ نے۔

برنی جب علاء الدین کو دیکھتا ہے جیسے وہ جاہل، ظالم، غیر معقول اور بے عمل سمجھتا ہے اور پھر اس کے عہد کی غیر معمولی کامرانیوں، عدیم المثال خوش حالی اور عمومی امن و امان کی کیفیت دیکھتا ہے تو وہ حیرت زدہ رہ جاتا ہے اسے علاء الدین کی شخصیت اور ان بے مثال کارناموں کے درمیان کوئی مطابقت نظر نہیں آتی۔ بالآخر اس کی توجیہہ یہ کرتا ہے کہ دراصل یہ تمام تر کامیابیاں اور کامرانیاں اس عہد میں حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی مبارک ذات کی برکات و فیوض تھیں۔ یہ محض شیخ کے انفاس قدسیہ کی برکت تھی کہ سلطان کے ظلم و جبر کے باوجود عام خوش حالی اور فارغ البالی کا دور دورہ تھا اور ایسے محیر العقول کارنامے ممکن ہو سکے۔[۳] جہاں تک اس عہد میں دین داری اور مذہبیت کی عام فضا کا تعلق تھا وہ بھی شیخ ہی کے دم قدم سے تھی۔[۴] لیکن جب یہی مورخ علاء الدین کے بیٹے اور جانشین سلطان قطب الدین کے عہد حکومت کا ذکر کرتا ہے تو اس امر پر گہرے دکھ اور افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ سلطان علاء الدین کی آنکھ بند ہوتے ہی اہالیان دہلی قطب الدین کے زیر اثر سر سے پاؤں تک برائیوں میں غرق ہو گئے۔[۵] یہ

۱؎ تاریخ فیروز شاہی ص ۳۶۶، سیر الاولیا ص ۵۹۹ ۲؎ سیر العارفین، اردو ترجمہ ص ۱۰۰ نیز دیکھیے فرشتہ جلد دوم ص ۲۱۶ ۳؎ تاریخ فیروز شاہی ص ۳۲۴-۳۲۵، ۳۴۱-۳۴۶ ۴؎ تاریخ فیروز شاہی ص ۳۴۲-۳۲۵، ۳۸۶-۳۸۰ ۵؎ تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۸۵، ۳۸۶-۳۸۰

یا دلانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ شیخ ابھی حیات تھے اور منصب ارشاد پر فائز۔ ان کا فیض عام ویسے ہی جاری وساری تھا۔ اس پوری صورت حالات سے جو بات واضح طور پر ابھر کر سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ دینداری اور مذہبیت کی جو عام فضا عہد علائی میں پائی جاتی تھی اس میں بہت کچھ دخل سلطان کے سخت گیر قوانین اور تعزیرات کا تھا جس نے کھلے عام برائیوں کے ارتکاب کو تقریباً ناممکن بنا دیا تھا اور جیسے ہی یہ دباؤ ہٹا آبادی کا ایک معتد بہ حصہ اپنے پرانے رجحانات اور میلانات کی طرف لوٹ گیا۔ برنی عہد علائی کی کامیابیوں کو علاء الدین کے حق میں استدراج گردانتا ہے[۱] لیکن شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے ملفوظات سے سلطان کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ ایک ولی کامل کی تصویر ہے[۲]

اس خصوصی رشتے سے جو غیاث پور اور دربار کے درمیان قائم ہو گیا تھا اور اس کے نتیجے میں چشتی سلسلہ کو جو سیاسی سرپرستی حاصل ہوئی اس سے ایک تو واضح فائدہ یہ ہوا کہ سلسلہ کی مخالفت کا زور ٹوٹ گیا اور اس طرح وابستگان سلسلہ کو یہ موقع ملا کہ پوری یکسوئی اور دلجمعی سے اس کے حلقہ اثر کی توسیع کا کام کر سکیں۔ خود چشتی مآخذ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ بعض حلقوں میں چشتیوں کے لئے خاصے سخت مخالفانہ بلکہ معاندانہ جذبات پائے جاتے تھے۔ جو مسائل بالخصوص بنائے مخاصمت تھے ان میں سماع کا مسئلہ خاصا اہم تھا اور بعض علماء اس کے تعلق سے چشتیوں پر سخت نکتہ چینی کرتے تھے۔ لیکن حکمراں خاندان اور حکمراں طبقے کی سرپرستی نے مخالفت کی اس باد تند و تیز کو کافی مدھم کر دیا اور ان کے لئے یہ ممکن ہو سکا کہ اپنے مشاغل کو کافی حد تک پر سکون ماحول میں جاری رکھ سکیں۔ مشائخ چشت کے سوانح نگار اور ممتاز چشتی اہل قلم امیر خورد نے بڑے واضح انداز میں اس کا اعتراف کیا ہے[۳]

سلطان علاء الدین اور چشتی سلسلہ کے خصوصی تعلقات کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ

۱؎ تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۲۵ ۔ ۲؎ خیر المجالس، ص ۲۴۱ ۔ ۲۴۲

۳؎ سیر الاولیاء، ص ۵۳۶ ۔ ۵۳۷

سلطان علاء الدین کا ذکر چشتی مآخذ میں ہمیشہ اچھے انداز میں کیا جاتا ہے اور غالباً کسی مقام پر بھی اس کی شخصیت، کردار اور پالیسیوں پر کسی طرح کا کوئی نقد و تبصرہ نہیں پایا جاتا جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں چشتی مآخذ نے سلطان کی جو تصویر آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کی ہے وہ ایک ولی کی تصویر ہے [1] برنی سلطان کا تذکرہ بہت تلخی سے کرتا ہے۔ وہ سلطان کے جہل، عبادات کی عدم پابندی اور اس کے ظالمانہ طریق کار کے بارے میں بہت سخت بیانات دیتا ہے [2] لیکن چشتی مآخذ میں اس طرح کے کسی نقد کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ شیخ نظام الدین اولیاء کو حکمراں خاندان اور حکمراں طبقے میں غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی اور اس حلقے میں ان کے اثرات غیر محدود تھے لیکن اس عہد کے تاریخی اور چشتی مآخذ میں کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی جس سے اس بات کا کچھ بھی اندازہ ہوتا ہو کہ شیخ نے کسی بھی مرحلے پر سلطان کی ذاتی اصلاح یا اس کی پالیسیوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی ہو اور اپنے غیر معمولی اثرات کو اصلاح احوال کے لئے استعمال کیا ہو۔ لیکن شائد حکمرانوں کی اصلاح اور ان کی پالیسیوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش، جس کا اثر بالواسطہ بے شمار بندگان خدا پر پڑتا، ان کے پروگرام میں شامل نہیں تھی۔ اس سے نہ تو انھیں دلچسپی تھی اور نہ اسے شاید وہ ضروری ہی سمجھتے تھے۔ اگر ملفوظات اور دوسرے چشتی مآخذ کو بغور پڑھا جائے تو بین السطور میں سلطان کی پالیسیوں کی ایک طرح سے توثیق ہی ملتی ہے۔ ایک مصری عالم مولانا شمس الدین ترک جو ہندوستان میں علم حدیث کی اشاعت کے مقصد سے دہلی تشریف لا رہے تھے، جب انھوں نے سنا کہ بادشاہ جمعہ نہیں پڑھتا اور جماعت میں حاضر نہیں ہوتا تو وہ ملتان سے واپس لوٹ گئے اگرچہ بعض دوسری خصوصیات کے لئے انھوں نے سلطان کی ستائش بھی کی [3] یہ بات کتنی حیرت انگیز ہے کہ ان

---

[1] خیر المجالس، ص۲۴۱-۲۴۳ [2] تاریخ فیروز شاہی، ص۲۶۲، ۲۸۶-۲۹۵، ۲۲۵، ۲۲۸-۲۹

[3] تفصیلات کے لئے ملاحظہ کیجئے تاریخ فیروز شاہی ص۲۹۷-۲۹۹ جس سال مولانا شمس الدین ترک کی آمد اور واپسی ہوئی اسی سال سلطان نے بعض بہت بنیادی مسائل کے سلسلہ میں قاضی مغیث الدین سے

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

معاملات پر توجہ دینے کی ضرورت حضرت شیخؒ نے کبھی محسوس نہیں فرمائی۔

علاء الدین کا انتقال انتظامیہ اور اخلاق عامہ دونوں میں ڈھیل اور زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوا[۱] اس نے جو مضبوط اور موثر انتظامی ڈھانچہ برسوں کی کاوش کے بعد تیار کیا تھا وہ ایک دم ناکارہ ہو کر رہ گیا۔ مختلف اسباب کی کارفرمائی کے باعث ولی عہد سلطنت شاہزادہ خضر خاں کے بجائے قطب الدین مبارک خلجی سلطان بنا اور اس کی قائم کی ہوئی مثال کی پیروی کرتے ہوئے دہلی کی آبادی گناہ کی آلودگیوں میں ڈوب گئی[۲]۔ جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ اس وقت حضرت شیخ نہ صرف حیات تھے بلکہ اپنی مقبولیت کی آخری بلندیوں پر رونق افروز تھے۔ لیکن سلطان علاء الدین کے انتقال سے دراصل وہ بند ٹوٹ گیا جو اس نے جرائم اور معاشرتی برائیوں کے خلاف باندھ رکھا تھا۔ ان دونوں سلاطین کے عہد میں چشتی سلسلہ کی عمومی کارکردگی کا ایک تقابلی مطالعہ اس سیاسی سرپرستی کی صحیح نوعیت اور اہمیت کو روز روشن کی طرح اجاگر کر دیتا ہے جو علاء الدین کے عہد میں سلسلہ کو حاصل رہی۔

صرف یہی بات کہ معزول ولیعہد شاہزادہ خضر خاں شیخ کا مرید تھا، شیخ اور سلطان قطب الدین کے مابین غلط فہمی کا بیج بونے کے لئے کافی تھی اور اس صورت حال سے سلسلہ کے پرانے دشمنوں نے ضرور فائدہ اٹھایا ہوگا جو سلطان علاء الدین کے خوف سے اب تک خاموش تھے۔ لیکن یہ بات واضح رہے کہ غلط فہمیوں کے باوجود سلطان قطب الدین نے کم از کم ابتدا میں شیخ کے ساتھ کھلی دشمنی کا مظاہرہ نہیں کیا جیسا کہ سیر الاولیاء کی محولہ بالا عبارات

سوالات کئے۔ قاضی صاحب کا تعلق دربار سے تھا اس لئے صوفیہ کی عام اصطلاح میں وہ نہ صرف علماء ظاہر کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے بلکہ علماء سوء کے گروہ سے بھی۔ ہم کی نسلیں ضیاء الدین برنی کی مورخانہ بصیرت کی ممنون ہیں کہ اس نے اس پورے سوال و جواب کو محفوظ کر دیا ہے۔ حق یہ ہے کہ جس جرات و صفائی سے قاضی صاحب نے سلطان وقت کے سامنے اظہار حق کیا ہے وہ علماء اسلام کی تابناک روایت کے عین مطابق ہے۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ کیجئے تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۸۹-۲۹۷ [۱] تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۸۵، ۳۸۶-۳۸۷، ۳۹۲، ۳۹۵۔ [۲] تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۸۲، ۳۸۶-۳۸۷ [۳] سیر الاولیاء ص ۵۳۶-۵۳۷

سے مترشح ہوتا ہے[۱] ایک بنیادی چشتی مآخذ میں اس انداز میں سلطان کا ذکر قابل غور ہے۔ غالباً اپنی حکومت کے آخری عہد میں چشتی سلسلہ کے مخالفوں کے اکسانے[۲] اور اپنی ذاتی غلط فہمیوں کے زیر اثر اس نے شیخ کے خلاف کسی قدر سخت رویہ ضرور اختیار کیا[۳] لیکن یہ بات کبھی فراموش نہ کرنی چاہئے کہ متعدد اہم ارکین حکومت جو شیخ کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے ان سے یہ مطالبہ نہیں کیا گیا کہ وہ شیخ سے قطع تعلق کرلیں اور نہ ہی حکومت میں ان کی حیثیت اور منصب پر کوئی اثر پڑا۔ امراء کو شیخ کی زیارت سے روکنے کا غالباً بنیادی مقصد فتوح کے بہاؤ کو روکنا تھا[۴]

جو اختلاف سلطان کے اس اصرار کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا کہ شیخ کم از کم ہر چاند رات کو دربار میں حاضر ہوں باوجود کوشش کے حل نہ ہو سکا قبل اس کے کہ سلطان شیخ کے خلاف کچھ اقدامات کی ابتدا کرتا اس کو قتل کر دیا گیا۔ چشتی مآخذ بین السطور اس قتل کے لئے سلطان کی شیخ سے دشمنی کو اس کا بنیادی سبب بناتے ہیں[۵] خود شیخ نے اس کا حل یہ نکالا کہ وہ اپنی والدہ کی قبر پر تشریف لے گئے اور سلطان کے رویہ کی شکایت کی اور کہا کہ اگر مہینہ کی پہلی تاریخ تک اس کا کچھ بندوبست نہ کیا گیا تو وہ پھر وہاں نہ آئیں گے! واضح رہے کہ اس طرح کی پریشانیوں کے وقت والدہ کے مزار پر حاضری ان کا معمول تھا اور عموماً اس سے چشتی مآخذ کی رائے میں مسائل حل ہو جایا کرتے تھے[۶]

---

[۱] سیر الاولیاء، ص ۵۲۶ - ۵۲۷ [۲] سیر الاولیاء، ص ۱۶۰، ۵۲۴ - ۵۲۷ [۳] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۶۶ [۴] تاریخ فیروز شاہی ص ۳۷۹، ۳۹۶، ۴۰۹ - ۴۱۰، خیر المجالس ص ۲۵۸ سیر العارفین، ص ۱۰۰ - ۱۰۱، فرشتہ، جلد دوم، ص ۳۹۵ - شیخ کے جو مریدین قطب الدین خلجی کی حکومت میں نہایت اہم عہدوں پر فائز تھے ان میں ملک وحید الدین قریشی اور ملک قیر بیگ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ملک قیر بیگ کے بارے میں برنی لکھتا ہے کہ ۱۴ مناصب اس کے حوالہ تھے۔ ملاحظہ کیجئے تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۷۹، ۳۹۶، سیر العارفین ص ۱۰۳ [۵] سیر الاولیاء، ص ص ۱۶۰ - ۱۶۱، سیر العارفین، ص ص ۱۰۰ - ۱۰۵ نیز دیکھئے تاریخ فیروز شاہی ص ۳۹۶

[۶] سیر الاولیاء، ص ص ۱۶۰ - ۱۶۱

خسرو خاں کے عہد حکومت اور اس کی نوعیت پر کسی مفصل گفتگو کا یہ موقع نہیں ہے۔ بار، یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ شیخ کے دو مرید، ضیاء الدین برنی اور امیر خسرو، خسرو خاں کی حکومت پر سخت ترین تنقید کرتے ہیں اور اس کے خلاف اسلام کو دہلی سے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی سازش کا سنگین الزام عائد کرتے ہیں[1]۔ ساتھ ہی ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ شیخ کے کئی مرید اس کی حکومت میں اہم عہدوں پر فائز رہے[2]۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ شیخ نے خسرو خاں کا پانچ لاکھ ٹنکہ کا خطیر نذرانہ قبول فرمایا[3]۔ جیسا کہ معلوم ہے مشائخ چشت عام حالات میں بھی حکمرانوں کے تحائف اور نذرانے قبول کرنے سے احتراز کرتے تھے لیکن یہ گراں قدر تحفہ نہایت غیر معمولی اور مشتبہ حالات میں قبول کیا گیا۔ اسباب و علل جو بھی رہے ہوں اس کا قبول کیا جانا ایک طرح سے خسرو خاں کی حکومت کو قبول کرنے کے مترادف تھا اور اسے ایک طرح سے جواز عطا کرتا تھا ایک طرف تو یہ خسرو خاں کے لئے بہت تقویت کا باعث بنا ہوگا۔ دوسری طرف یہ شیخ کے ان مریدین اور وابستگان کے لئے بیحد اطمینان کا باعث ہوا ہوگا جو خسرو خاں کی حکومت میں مختلف عہدوں اور اعلیٰ مناصب پر فائز تھے۔ اگر اس سلسلہ میں ان کے ضمیر میں کچھ خلش رہی ہوگی تو وہ دور ہو گئی ہوگی۔ یہ مسئلہ پھر بھی تشنہ جواب رہتا ہے کہ شیخ نے اپنے آپ کو ایک ایسی صورت حال میں کیوں الجھایا جس میں ان کے اوپر ایک طرف تو یہ شبہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ ایک ایسے شخص کے حلیف بن گئے ہیں اور اسے اخلاقی مدد بہم پہونچا رہے ہیں جو خود ان کے نہایت عزیز مریدین کے بیان کے مطابق دشمن اسلام تھا نیز جس کی گردن پر چشتی سلسلہ کے محسن علاء الدین خلجی کے پورے خاندان کا خون تھا۔ خسرو خاں سے دلچسپی کا سبب کہیں یہ تو نہیں تھا کہ وہ سلطان قطب الدین خلجی کی حکومت کے اختتام کا ذریعہ بنا جو کھلم کھلا شیخ کی مخالفت پر کمربستہ ہو گیا تھا۔ تو قع تو یہ تھی کہ سلطان قطب الدین سے مناقشہ کے پیش نظر حکومت سے تعلقات کے مسئلہ میں

---

[1] تاریخ فیروز شاہی صہ ۴۱۲ - ۴۱۳ ، امیر خسرو، تغلق نامہ، تصحیح سید ہاشمی فرید آبادی، اورنگ آباد ۱۹۳۵ء صہ ۵۷-۵۷ [2] تاریخ فیروز شاہی، صہ ۴۱۱ [3] سیر العارفین، صہ ۱۱۹، فرشتہ، جلد دوم صہ ۳۹۷

کچھ زیادہ ہی احتیاط برتی جانے لگی ۔ یا پھر اسی تلخ تجربہ نے انھیں غیر معمولی طور پر محتاط بنا دیا تھا اور انھوں نے نئے حکمراں سے منازعت سے بچنا چاہا اس لئے کہ اس بات کا انھیں ذاتی تجربہ ہو چکا تھا کہ حکمراں وقت سے مخاصمت سلسلہ کے لئے مضر تھی اور اس سے اس کی ترویج و اشاعت پر ناخوشگوار اثرات مرتب ہوتے تھے قطب الدین خلجی کے عہد حکومت سے پہلے چشتی سلسلہ کو حکمرانوں کی مخالفت کا کوئی تجربہ نہ تھا اور غالباً اسی وجہ سے اسے زیادہ ہی شدت سے محسوس کیا گیا ۔ اب تک انھیں حکمرانوں کی طرف سے عزت و احترام اور تعظیم و تکریم کا معاملہ ہی دیکھنے کو ملا تھا اور وہ اسی کے عادی ہو گئے تھے اور غالباً غیر شعوری طور پر اسے اپنا حق سمجھنے لگے تھے اور سبھی سے اسی کی توقع کرنے لگے تھے ۔

یہی مخصوص ذہنی اور نفسیاتی کیفیت تغلق عہد میں سلسلہ کی پریشانیوں کا بنیادی سبب بنی حکمرانوں اور حکمراں طبقے کی طرف سے مسلسل عزت و توقیر کا رویہ اور اس کے نتیجے میں ملنے والی سیاسی سرپرستی نے ان کے اندر سے مخالف ماحول میں کام کرنے اور اس سے مطابقت پذیری کی صلاحیت کو مضمحل کر دیا تھا ۔ اس صورت حال کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کے تعلق سے چشتی رویہ میں ایک بہت بنیادی تضاد پیدا ہو گیا ۔ نظریاتی طور پر وہ حکومت سے کسی طرح کا بھی تعلق نامناسب خیال کرتے تھے اور اسے سالک کے لئے باعث مضرت تصور کرتے تھے لیکن اب عملاً صورت حال یہ ہو گئی تھی کہ مختلف اسباب کی بنا پر اپنی اس وسیع تنظیم کو چلانے اور اس کے لئے وسائل کی فراہمی کے سلسلہ میں حکومت پر ان کا انحصار بہت بڑھ گیا تھا ۔ ایک طرف تو وہ سلاطین کو بھی خانقاہ میں حاضری کی اجازت نہ دیتے تھے اور دربار و ایوان حکومت سے کنارہ کشی کے معاملہ میں مبالغہ کی حد تک اصرار کرتے تھے ، دوسری طرف ان کی خانقاہ میں شاہزادوں ، شاہی خاندان کے افراد ، امراء سلطنت اور عہدیداران حکومت کا اژدہام لگا رہتا تھا اور دوسرے مریدین مسلسل ان کے ربط میں رہتے تھے ۔ جب تک سیاسی سرپرستی حاصل رہی اس وقت تک یہ تضاد دبا رہا لیکن جب حالات بدلے اور سیاسی سرپرستی مشکوک اور غیر یقینی ہوتی چلی گئی تو نئے نئے مسائل پیدا ہونے شروع ہو گئے ۔ اور بالآخر جب یہ صورت حال باقی نہ رہی اور غیر ہمدرد

اور مخالف حکومتوں سے واسطہ پڑا تو یہ تضاد ابھر کر سامنے آگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محمد بن تغلق کے عہد میں اس تضاد اور بدلے ہوئے حالات سے مطابقت پذیری کی صلاحیت کے یکسر فقدان نے صورت حال اتنی خراب کر دی کہ مرکزی چشتی نظام کے لئے یہ دباؤ ناقابل برداشت ہوگیا اور اس کا شیرازہ بکھر گیا۔ ایک مرتبہ شیخ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ نے سیدی مولی سے کہا تھا کہ امراء اور ملوک کی صحبت تباہی کا پیش خیمہ ہوتی ہے[۱] یہ کتنا بڑا سانحہ ہے کہ یہ وارننگ خود اس تنظیم پر صادق آئی جس کی آبیاری خود انھوں نے اپنے خون جگر سے کی تھی اور اس کے حالات ان کے عزیز ترین مرید، خلیفہ ارشد اور جانشین کے زمانے میں پیدا ہوئے۔

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی، ص۲۰۹ ۔ فرشتہ، جلد اول ص۹۲ شیخ فرید الدینؒ اپنے مریدین کو یہ نصیحت کرتے تھے: لو اردتم بلوغ درجة الکبار فعلیکم بعدم الالتفات الی ابناء الملوک ۔ ملاحظہ کیجئے سیر الاولیا، ص۸۵

ھندوستان پبلی کیشنز کی اہم مطبوعات

۱۔ اسلام کی بنیادیں	حسن ایوب	۲۰/-
۲۔ تحریک اور دعوت	بہی الخولی	۲۵/-
۳۔ تحریک اسلامی، مشکلات، مسائل آزمائش	فتحی یکن	۱۴/-
۴۔ اسلامی حکومت، حقوق و فرائض	عبدالکریم زیدان	۷/-
۵۔ اخوان المسلمون، مقصد، مراحل، طریقہ کار	سعید حوی	۱۵/-
۶۔ تصوف کی تین اہم کتابیں	سید احمد عروج قادری	۷/۵۰

ملنے کے پتے

۱۔ ہندوستان پبلی کیشنز۔ ۲۳۔ مدن موہن برمن اسٹریٹ۔ کلکتہ ۷۰۰۰۰۷

۲۔ ہندوستان پبلی کیشنز۔ ۸۱۔ انگپا نائک اسٹریٹ۔ مدراس ۶۰۰۰۰۱